سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا۔ پھر بھی اپنے والد اور بھائی کی وفات کے بعد ایک گوشہ نشین آدمی تھا۔ تاہم سترہ

You must continue to be faithful and devoted subjects as in it lies the satisfaction of the Govt and your welfare.

11-6-1849 Lahore.

Translation of Mr Robert Cust's Certificate.

To

Mirza Ghulam Murtaza Khan Chief of Qadian.

As you rendered great help in enlisting sowers & supplying horses to Govt in the Mutiny of 1857 and maintained loyalty since its beginning up to date and thereby gained the favour of Govt a Khilat worth Rs 200/- is presented to you in recognition of good services,

نقل مراسلہ

(رابرٹ کسٹ صاحب بہادر کمشنر لاہور)

تہور و شجاعت دستگاہ مرزا غلام مرتضےٰ رئیس قادیان بعافیت باشند۔

ازآنجاکہ ہنگام مفسدہ ہندوستان موقوعہ ۱۸۵۷ء از جانب آپکے رفاقت و خیر خواہی و مدد دہی سرکار دولتمدار انگلشیہ در باب نگاہداشت سواران و بہمرسانی اسپان بخوبی بمنصہ ظہور پہونچی اور شروع مفسدہ سے آجتک آپ بدل ہواخواہ سرکار رہے اور باعث خوشنودی سرکار ہوا لہٰذا بجلدوی اس خیر خواہی اور خیر سگالی کے خلعت مبلغ دو صد روپیہ کا سرکار سے آپ کو عطا ہوتا ہے اور حسب منشاء چٹھی

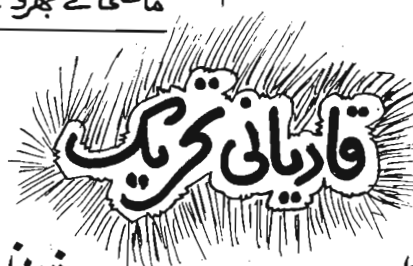

زیڈ۔ اے سلیری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ صفِ اوّل کے کہنہ مشق اور اصول پرست صحافی ہیں۔ انہوں نے مرزائیت کی گود میں جنم لیا، اسی ماحول میں پرورش پائی، لیکن انگریز کے اِس خودکاشتہ پودے کا دامِ تزویر انہیں گرفتار نہ کر سکا اور ان کے جرأت مند آزاد ذہن نے مرزائیت کے دجل و فریب اور مکر و تلبیس کے خلاف بغاوت کر دی۔ زیرِ نظر مضمون ان کا تحقیقی شہ پارہ ہے جو آج سے تیس برس قبل تحریر کیا گیا اس میں مرزائیت کے خدوخال کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان حالات و واقعات کا بھی تجزیہ ہے جن کے تحت مرزا غلام کادیانی نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور وہ اس کے محرک بنے۔ مضمون اپنی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر ہدیۂ قارئین ہے۔

"ادارہ"

احمدیہ تحریک جسے عرفِ عام میں قادیانی تحریک کہا جاتا ہے، کیسے معرضِ وجود میں آئی، اس سوال کا جواب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک ہم ولیم ہنٹر کی اس رپورٹ کا تفصیلی جائزہ نہ لیں جو انہوں نے "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے عنوان سے برطانوی حکومت کو پیش کی تھی اور جس پر

"کیا وہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے مذہبی پابند ہیں؟"

کا اشتعال انگیز ذیلی عنوان ثبت تھا۔ یہ کتاب رپورٹ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔ وہائٹ ہال میں اس پر گہرا غور و فکر ہوا اور اس رپورٹ کے مندرجات کی اساس پر مسلمانانِ ہند کے متعلق ایک نئی پالیسی

اختیار کی گئی ۱۸۸۸ء میں مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ایک ایسی نبوت جس کا مقصدِ اولیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں پر جہاد کی پابندی ختم کی جائے اور انہیں برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ امن و امان سے رہنے کی تلقین کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کتاب کا مرزا صاحب کی نبوت سے کیا تعلق ہے؟

سر ولیم ہنٹر کو جو ملکۂ ہند کی حکومت میں ایک اعلیٰ افسر تھے مسلمانوں کے معاندانہ رویہ پر بے حد تشویش تھی جس کا مظاہرہ سید احمد شہید کی ملک گیر تحریک میں ہوا تھا جس نے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دی تھی کہ وہ کسی بھی غیر ملکی اور غیر مسلم حکومت کے زیرِ سایہ مسلمان نہیں رہ سکتے اور یہ کہ ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے۔ دارالحرب کے اس تصور کے بعد مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے تھے۔

اوّلاً ــــ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کیا جائے اور ہندوستان کو ایک بار پھر دارالاسلام میں تبدیل کیا جائے جہاں مذہب کا علم لہرائے۔ یا

ثانیاً ــــ کسی ایسی جگہ ہجرت کی جائے جہاں اسلامی تعلیمات پر بلا روک ٹوک نہ صرف عمل کیا جا سکے بلکہ ان کی توسیع و اشاعت بھی ہو سکے۔

اس اندازِ فکر نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور انہیں ملکۂ ہند کی حکومت کے خلاف اگر عملی طور پر نہیں تو ذہنی طور پر بغاوت کے لئے ابھارا۔

وہابی تحریک جس کے عروج کا علم چالیس برس تک پورے شمال مشرقی اور شمال مغربی ہندوستان پر لہراتا رہا۔ اس وقت برطانوی حکومت کے جور و استبداد کا نشانہ بنی ہوئی تھی لیکن سر ولیم کے نقطۂ نظر میں یہ جسمانی جبر و ایذا مسلمانوں کے مسئلہ کا مناسب اور دیرپا حل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اصل حل یہ تھا کہ مسلمان عقیدۃً برطانوی حکومت کا سایہ قبول کر لیں یا کم از کم اسلامی تعلیمات کی توضیح و تشریح اس انداز سے نہ کریں جس سے انگریزی حکومت کے خلاف دشمنی اور نفرت کے جذبات ابھریں۔

یہ کیسے ہو؟

ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی حل تھا کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے جہاد اور غیر ملکی سامراج کے خلاف بغاوت کا جذبہ نکال دیا جائے لیکن مسلمان کی عام رائے اس قسم کی مفاہمت کے لئے تیار نہیں تھی۔

احمدیہ تحریک کے ایک سرسری جائزے سے ہی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کا مقصد عظیم اسلامیانِ ہند کے دلوں میں برطانوی حکومت کے لئے صلح و آشتی کا وہ جذبہ پیدا کرنا تھا جس کی سر ولیم کو آرزو تھی چنانچہ مرزا غلام احمد کی تعلیمات میں جہاد کو منسوخ کر دیا گیا اور آیت اولوالامر منکم کا مطلب یوں ڈھالا گیا کہ اولوالامر سے مراد برسرِ اقتدار حکومت ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اس لئے

"عامۃ المسلمین کا یہ سمجھنا کہ احمدی انگریز کا خود کاشتہ پودا ہیں بلا وجہ نہیں تھا"

اور احمدی رہنماؤں کے مسلسل فخریہ اعلانات نے کہ انگریزوں کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات ہیں اس تاثر میں اور وزن پیدا کر دیا۔ یہ بات عام تھی کہ انگریز سرکاری ملازمتوں میں احمدیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ:

"وائسرائے کی ایگزیکٹو میں ایک ممبر کی حیثیت سے سر ظفر اللہ کا تقرر اس کی ذاتی قابلیت سے زیادہ اسی حقیقت کی وجہ سے تھا"

یہ پس منظر اسی احمدیہ تحریک کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کافی تھا مسلمان ـــــ جو اپنے زوال اور اپنی تہذیب کی جگہ مغربی تہذیب کے آ جانے سے بے حد مضطرب تھے۔ برتری تہذیب کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بجا طور پر یہ سمجھنے لگے کہ مغربی تہذیب صرف اسی صورت میں یہاں قدم جما سکتی ہے کہ مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم کو نیست و نابود کر دیا جائے ـــــ سر ولیم ہنٹر کی کتاب اس حقیقت اور خاص طور پر مسلمانانِ بنگال کی صورت حالات کی غماز ہے۔

تاہم جس چیز نے مسلمانوں کے دلوں میں احمدیت کے خلاف انتہائی نفرت اور دشمنی پیدا کر دی وہ یہ تھی کہ مرزا صاحب نے اپنی تحریک اور مشن کی اساس ختمِ نبوت کے مسلّمہ عقیدہ کی قطعی تنقیص پر رکھی۔ یہ بات تو خیر قرینِ قیاس ہے کہ ایک نئے عقیدے کے عنوان سے ایک نئی نبوت کی بنیاد رکھی جائے جیسا کہ بہاء اللہ نے کیا۔ لیکن اسلام میں ایک نئی نبوت کا دروازہ کھولنا اسلام کی بنیادی قدروں کے لئے خطرناک طور پر تباہ کن ہے اور اگر اس بات کی سند مل جائے کہ کسی کلمہ گو کا فر کہا جا سکتا ہے تو:

"دائرۂ اسلام میں احمدیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ احمدی رسول اللہ پر ایمان لاکر مسلمان نہیں ہوجاتے۔ جس طرح عیسائی حضرت موسیٰ کو مان کر یہودی نہیں ہو جاتے یا خود مسلمان حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ پر ایمان رکھ کر عیسائی یا یہودی نہیں بن جاتے۔"

یہ ختمِ نبوت کا عقیدہ ہی تو ہے جس پر مسلمان ایک امت کی حیثیت سے منسلک اور منظم ہیں۔ ختمِ نبوّت کے تصوّر ـــــ جسے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس نفی سے اجماعِ امت کی بنیادیں متزلزل ہوکر رہ جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں ختمِ نبوّت کا تصوّر محض رسول اللہ کی عظمت کا اعتراف ہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ قرآنی نقطۂ نظر سے انسانیت کے ارتقاء کے بنیادی اصولوں کا جزوِ لاینفک ہے اور اسے علامہ اقبال نے اپنے لیکچروں میں خوب واضح کیا ہے۔ علامہ کی نگاہ میں ختمِ نبوّت انسان کی تکمیل کا نشان ہے جسے قرآن کے ذریعہ وہ تمام ہدایات عطا کر دیں جن کی اسے اپنی روحانی اور مادی ترقی کے لئے ضرورت ہو سکتی تھی اور اسے اپنی قسمت خود تعمیر کرنے کا مختار بنایا گیا۔ قرآن نے اپنی ذمہ داریوں کا پُر زور اعتراف کیا ہے خدا نے رسولِ اکرم کو بار بار کہا "اے رسول! کہے دے کہ اگر میں چاہتا تو دنیا میں کوئی کافر نہ ہوتا لیکن یہ انسان کے منصبِ اختیار کے خلاف ہوتا۔ اس لئے اسے فرمانِ خداوندی کے قبول یا رد کرنے میں اختیار دیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ دین مکمل ہوجانے کے بعد ـــــ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (القرآن) انسانیت کو خدائے برتر کے مقاصد کو اپنی سعی و کوشش کے بمطابق پورا کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

اس بحث کی روشنی میں مرزا صاحب کے مشن میں کوئی جان نہیں اور ان کے پیروکار امتِ مسلمہ میں شمار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

تاہم یہ بات تحقیق طلب ہے کہ مرزا صاحب کو اپنے مشن میں اتنی بڑی کامیابی کیسے ہوئی دراصل اس کے اسباب ان حالات کی پیداوار ہیں جن میں انہوں نے کام کیا۔ برطانوی حکومت کی مذہبی رواداری پالیسی کا مطلب ہر قسم کے مذہبی اور فرقہ وارانہ مناقشات کے لئے صلائے عام تھا۔ مسلمانوں کا نیرازہ پہلے ہی بکھر چکا تھا جب کہ ان کے طریقہ ہائے تعلیم اور قوانینِ تعزیر سے جس نے انہیں محلبسی

مذہبی اور قانونی طور پر ایک لڑی میں منسلک کر رکھا تھا ختم کر دیئے گئے اور اس طرح مذہبی تعلیمات اور ان کی تشریح و توضیح کا کام ان جاہل علماء کے ہاتھوں میں چلا گیا جو ان کے ساتھ کھیلنے لگے۔

اس کے برعکس عیسائی مشن اور آریہ سماج جیسے انقلابی ہند و اسلام پر یک حملے کر رہے تھے کہ جنگِ آزادی میں شکست کھا جانے کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا یہ کمزور ترین پہلو سمجھا جاتا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس تثلیثی کش مکش کی قوتیں نابرابر تھیں۔ ایک طرف روپیہ اور تنظیم تھے تو دوسری طرف تعلیم کی کمی اور تنظیم کا فقدان۔ اس کش مکش میں مسلمان پستے چلے گئے۔ ان حالات میں مرزا صاحب نے اسلام کی طرف داری کا بہروپ اختیار کیا۔ فریب خوردہ عوام نے سراہا تو مرزا صاحب مطلق العنان لیڈرشپ کے خواب دیکھنے لگے۔

اس کامیابی کے ساتھ برطانوی حکومت کی ضرورت بھی اُبھری کہ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہ پیدا کی جائے لیکن یہ مفاہمت جہاد اور دارالحرب کے تصورات کو ختم کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ ان خطوط پر پہلے بھی کوشش کرائی جا چکی تھی۔ بعض مدرسۂ فکر کے رہنما غیر ملکی حکومت کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کا اعلان کر چکے تھے لیکن یہ کوششیں مسلمانوں میں قبولیتِ عامہ حاصل نہ کر سکیں۔ مرزا صاحب کی اپنی بڑھتی ہوئی آرزو کے ساتھ ساتھ انگریز کی ضرورت تھی جس نے انہیں نبوت جیسے بلند مقام پر ہاتھ مارنے کے لئے ابھارا۔ سمجھا یہ گیا کہ ان تصورات اور عقائد کی تنقیص کے لئے جن کا ماخذ وحی اور الہام ہو ایک اوتار اور نبی ہی کی ضرورت ہے۔ یہ کام خاصا نازک ہی نہیں مشکل بھی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا صاحب نے ایک نبوی جوش و خروش سے جہاد کے تصور کی نفی اور انگریز کی وفاداری کے لئے بے پناہ کام کیا۔ گویا مسلمان مذہبی راہنماؤں کی کمزوری اور برطانوی حکومت کی اس ضرورت نے کہ ہندوستان میں جسے انہوں نے مسلمانوں سے ہی چھینا تھا۔ ایک مضبوط حکومت کے لئے موافق حالات پیدا کئے جائیں۔ مرزا صاحب کے مشن کو جنم دیا۔

لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ احمدی جماعت نشو و نما پاتی رہی۔ حالانکہ وہ خوش گوار حالات جن میں اس جماعت کی تخلیق اور پرورش ہوئی اور تمام تصورات دن کی روشنی کی طرح واضح ہو چکے اور علم کا نور پھیل چکا تھا جس کا مظاہرہ اقبال کے لافانی کلام میں ہوا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تقدیر ایک